© rasailojaraid.com

فہمِ قرآن

(۷)

دوسری بات یہ ہے کہ "اٰتی" اور "نھیٰ" ان دونوں فعلوں کی اِسناد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو رہی ہے۔ اب گفتگو یہ ہوسکتی ہے کہ اسناد حقیقی ہے یا مجازی؟ اسناد مجازی کی صورت یہ ہوگی کہ دراصل "ایتا" اور "نھی" کا فاعل یا مَاھُوَلَہٗ تو ہے خداوند تعالیٰ لیکن مجاز عقلی کے متعدد علاقوں میں سے کسی ایک علاقہ کے متحقق ہونے کی وجہ سے فعل کی اسناد بجائے اللہ کے رسول کی طرف کردی گئی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہاں اسناد حقیقی ہے اور اسناد مجازی ماننے کے لیے کوئی قوی وجہ بالکل نہیں ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اس قسم کے موقع پر اگر کوئی بات بڑھا چڑھا کر پُرعظمت طریقہ سے بیان کرنی منظور ہوتی ہے تو وہاں اسناد مجازی سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً آپ اگر جامع مسجد دہلی کی عظمت بیان کرنا چاہتے ہیں تو کہیںگے "یہ مسجد شاہجہاں بادشاہ نے بنائی ہے" پس اگر آیت بالا میں واقعی ایتاء اور نھی کا فاعل اللہ تعالیٰ ہوتا تو اس سے عدول کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی بلکہ حکم کی عظمت اور اس کے قبول کرنے کو بتاکید بیان کرنے کا مقتضیٰ یہ تھا کہ بجائے رسول کے اللہ کو ہی فاعل بنایا جاتا۔ کیونکہ "اللہ کا حکم" بہرحال "رسول کے حکم" سے زیادہ عظمت رکھتا ہے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ بلکہ رسول اللہ کو دونوں فعلوں کا فاعل بنایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت اٰتی اور نھیٰ کی رسول کی طرف اسناد حقیقی ہے مجازی نہیں۔ اس بنا پر اب آیت کے صاف معنی یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو گئے کہ رسول اللہؐ بذاتِ خود جو چیز تم کو دیں اُس کو قبول کرو اور جس سے روکیں اُس سے رُک جاؤ۔[۱]

الحاصل یہ اور اسی طرح کی متعدد آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے احکام کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت کرنی ضروری ہے۔ اب بحث یہ ہے کہ قرآن مجید کی یہ آیات قطعی الثبوت اور قطعی الحکم ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو ان کا خارج میں کوئی مصداق موجود ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ اور کیا وہ سنت کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے؟

یہاں تک جو گفتگو تھی وہ قرآن مجید کی اُن چند آیات کے پیشِ نظر تھی جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور آپ کے ارشاداتِ گرامی پر عمل پیرا ہونے کا حکم تھا۔ اب آئیے یہ دیکھیں کہ قرآن مجید "سنت" کے بغیر سمجھ میں آ بھی سکتا ہے یا نہیں؟ اور اُس کا صحیح مفہوم و مطلب بغیر سنت کے متعین ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟

اصل یہ ہے کہ اگر قرآن کو سمجھنے کی کوشش میں سنت سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے تو قرآن صرف چند نامعلوم الحقیقت باتوں اور اخلاقی نصیحتوں کا ایک مجموعہ ہو کر رہ جائیگا، اور اسلام کے مکمل دستورِ اساسی ہونے کی حیثیت باطل ہو جائیگی، اور اس بنا پر وہ ایک جماعت کا مرتب و مہذب اور مکمل لائحہ عمل نہیں ہو سکیگا۔ مثلاً "اقیموا الصلوٰۃ" کے معنی و مصداق کی تحقیق میں اگر سنت سے مدد نہ لیجائے تو اس حکم کی تعمیل میں عجیب قسم کا انتشار نظر آئیگا۔ صلوٰۃ کے لغوی معنی دعا یا عبادت کے

[۱] حضرت ابو رافع کی ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں تم میں سے کسی ایسے کو نہ پاؤں جو اپنے تخت پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو اور جب اُس کے پاس کوئی ایسا حکم جس میں میں نے کسی کام کے کرنے کا امر یا نہ کرنے کی نہی کی ہو آئے تو وہ کہے کہ میں اسے نہیں جانتا میں تو وہی جانتا ہوں جس کو کتاب اللہ نے بیان کیا ہے" (ابوداؤد) مقدام بن معدی کرب کی حدیث ہے کہ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں تو صرف کتاب اللہ کے حلال و حرام کو ہی مانتا ہوں۔ خبردار ہو کہ جس کو رسول اللہ نے حرام کیا ہے وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کی طرح ہے۔ ان روایات میں حمار اہلی (گدھے) وغیرہ کی حرمت کا ذکر ہے جسے ہم آگے تفصیل سے بیان کرینگے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، پس کوئی صاحب تو اس حکم کی تعمیل اس طرح کریں گے کہ دعا مانگ لیا کریں گے اور اس کے لیے بھی کوئی خاص شکل اور کوئی خاص وقت نہیں۔ "وارکعوا مع الراکعین" کے امر کی تعمیل میں بھی اسی طرح ہڑبونگ نظر آئیگی۔ رکوع کے معنی لغتہً مطلق انحنا، جھکنا، ہیں۔ اب اگر رکوع کو اس کی حقیقت شرعیہ (جس کا ثبوت صرف سنت سے ملتا ہے) سے الگ کرلیا جائے تو یہ معلوم ہی نہیں ہوسکتا کہ وارکعوا مع الراکعین کے معنی کیا ہیں؟ اور اس کا مقصد کیا ہے۔ ایک صلوٰۃ و رکوع پر کیا موقوف ہے، زکوٰۃ، حج، اوقات و ارکانِ صلوٰۃ، ربوا، وغیرہ کسی کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اور پورے قرآن کو پڑھنے کے بعد بھی عبادات و معاملات کا کوئی مکمل جماعتی لائحۂ عمل مرتب نہیں ہوسکتا۔

امام بیہقی نے اپنی سند سے شبیب بن نضالۃ المکی سے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ عمران ابن حصین رضؓ نے چند لوگوں کے سامنے شفاعت کا بیان کیا، ایک شخص بولا "اے ابو النجید! تم ہمارے سامنے وہ احادیث بیان کرتے ہو جن کی اصل ہم کو قرآن میں نہیں ملتی" عمران یہ سن کر غضبناک ہوگئے اور آپ نے اس شخص سے فرمایا "تم نے قرآن پڑھا ہے؟" اس نے کہا "ہاں" فرمایا کیا تم نے قرآن میں کہیں یہ پڑھا ہے کہ عشاء کی فرض رکعتیں چار، مغرب کی تین، فجر کی دو، ظہر اور عصر کی چار چار ہیں" بولا "نہیں" حضرت عمران بن حصین رضؓ نے فرمایا "کیا ان سب رکعتوں کا علم تم نے ہم سے حاصل نہیں کیا، اور کیا ہم نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سیکھا ہے"

پھر عمران بن حصین رضؓ نے سوال کیا "کیا تمہیں قرآن میں کوئی ایسی آیت ملی ہے جس میں بتایا گیا ہو کہ چالیس بکریوں میں ایک بکری زکوٰۃ کی، اور اتنے اونٹوں میں ایک اونٹ، اور اتنے دراہم میں ایک درہم زکوٰۃ میں ادا کرنا ہوگا" اس شخص نے کہا "نہیں" آپ بولے "کیا زکوٰۃ کی ان تمام مقادیر و نصاب کا علم تم نے ہم سے اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سیکھا ہے" اس کے بعد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عمران نے فرمایا "قرآن مجید میں ہے" ولیطوفوا بالبیت العتیق" تو کیا قرآن نے تم کو یہ بھی بتایا ہے کہ سات طواف کیا کرو، اور اس سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم" کے پیچھے دو رکعت ادا کرو" پھر عمران ابن حصین نے فرمایا کیا تم نے قرآن میں یہ بھی دیکھا ہے؟

لاجلب ولاجنب ولاشغار فی الاسلام ۔ اسلام میں نہ جلب ہے، نہ جنب اور نہ شغار[۱]

کیا تم نے سنا نہیں قرآن ہی خود کہتا ہے" وما اٰتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا" اس تقریر کے بعد عمران بولے یہ اسلامی احکام (جو عبادات و معاملات سے متعلق ہیں) سب کے سب ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لیے ہیں، اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کا تم کو علم نہیں (یعنی قرآن مجید کی تلاوت کرنے کے باوجود)

اگر فہم قرآن میں سنت سے بالکل مدد نہ لیجائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ منقولات شرعیہ (یعنی وہ الفاظ جو لغتاً کسی معنی میں مستعمل ہوئے تھے لیکن شریعت نے ان کے معانی مخصوص متعین کر دیے ہیں مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، اعتکاف، طواف وغیرہ) کو ہم نہیں سمجھ سکتے، لغت کی روشنی میں بھی بعض آیات کے مفہوم کو صحیح طور پر متعین نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام زبان اور عربی فصاحت و بلاغت سے پورے طور پر واقف ہونے کے باوجود بعض آیات کا مطلب نہیں سمجھتے تھے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے۔ آیت ولِلّٰہِ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلاً نازل ہوئی تو ایک صحابی نے دریافت کیا: "العامنا ھذا یا رسول اللہ الخ" یہ حکم اسی سال کے لیے ہے یا ہر سال کے لیے؟ پھر آپ نے اس کی تشریح فرمائی کہ ایک شخص پر عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرنا فرض ہے۔ بشرطیکہ اس میں فرضیت

[۱] زکوٰۃ کی اصطلاح میں جلب اور جنب یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے والا زکوٰۃ کے مویشیوں کو دور ٹھیرکر زکوٰۃ دینے والوں کو اپنے پاس مویشیوں اور زکوٰۃ کی رقم کے لیے مجبور کرے۔ اور شغار کے معنی ہیں اپنی بیٹی کا دوسرے کے بیٹے سے اس شرط پر نکاح کرنا کہ وہ اپنی بیٹی اس کے بیٹے سے بیاہ دے۔ اسلام میں دونوں باتوں کی ممانعت ہے علامہ مفتاح الحاجۃ فی الاحتجاج ص ۶-۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ج کی شرائط پائی جائیں۔

تیمم سے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

وان لم تجدوا ماءً فتیمموا صعیدا طیبا۔ اگر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرو۔

توصحابۂ کرام کو واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ تیمم صرف وضو کی ضرورت کے وقت کے لیے ہے یا غسل ضروری کے لیے بھی۔ چنانچہ ایک صحابی کو سفر میں غسل کی ضرورت پیش آگئی اور وہاں پانی تھا نہیں اُنہوں نے اجتہاداً اپنے تمام بدن کو مٹی سے تیمم کرلیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو فرمایا "جو تیمم وضو کے قائم مقام ہے۔ وہی غسل کا بھی قائم مقام ہے" اس طرح کی بہتیری آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کا صحیح مفہوم متعین نہ فرما دیتے تو صحابہ کرام میں سخت اختلاف پیدا ہو جاتا اور قطعی طور پر ان کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا۔

پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ کیجیے کہ بعض اوقات کسی کلام کا صحیح مفہوم صرف مخاطب کے ذریعہ ہی متعین ہو سکتا ہے، مثلاً فرض کیجیے آپ اپنے کسی بیمار دوست کی عیادت کے لیے گئے ہیں اور اُس سے مزاج کی کیفیت دریافت کرتے ہیں تو وہ اُکتائے ہوئے لہجہ کے ساتھ کہتا ہے "اچھا ہوں" اس جملہ کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ اب وہ تندرست ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ بیمار دوست نے جو "اچھا ہوں" کہا تھا وہ کس لہجہ کے ساتھ کہا تھا۔ اور اس بنا پر اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو اُس کے الفاظ سے ظاہری طور پر متبادر ہوتا ہے، بلکہ دراصل مقصد یہ تھا کہ بیماری کو اتنا امتداد ہو گیا ہے کہ اب میں اپنے مرض کے متعلق کیا کہوں؟ بس یہی کہنا چاہیئے کہ اچھا ہوں۔

پس جب آپ روزمرہ کی گفتگو میں بعض جملوں کا مطلب اُن کے ظاہر المعنی ہونے کے باوجود

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مخاطب کی امداد کے بغیر نہیں سمجھ سکتے تو قرآن مجید کو سنت سے الگ کر کے کس طرح سمجھ سکتے ہیں جبکہ یہ معلوم ہے کہ قرآن مجید تشریع احکام کی کتاب سماوی ہے۔ اور اس کا نزول ایک خاص ماحول میں وقت کے پیش آمدہ مسائل کے جواب میں ایک خاص قسم کی نفسیات و طبائع رکھنے والی قوم کی زبان میں نجماً نجماً ہوا ہے، اور جس میں اخلاق و کردار کی اصلاح کے نفسیاتی اصول کو کہیں نظر انداز نہیں کیا گیا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے جس میں آپ فرماتے ہیں "کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں نہ ہو لیکن بات یہ ہے کہ ہماری سمجھ اُس کے فہم سے قاصر ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرماتا ہے۔

لتبین للناس ما نزل الیھم — تاکہ جو چیزیں آپ پر نازل کی گئی ہیں آپ لوگوں کے سامنے اُن کی تشریح کر دیں۔

امام شافعی فرماتے ہیں "سنت ثابتہ قرآن کے منافی نہیں بلکہ اُس کے مؤید ہے۔ اگرچہ قرآن میں سنت کے الفاظ کی نص صریح نہ ہو کیونکہ کوئی شخص قرآن کو ایسا نہیں سمجھ سکتا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو سمجھا ہے۔

حضرت مکحول الدمشقی فرماتے تھے :-

القرآن احوج الی السنۃ من السنۃ الی القرآن۔ — قرآن سنت کی طرف زیادہ محتاج ہے بہ نسبت سنت کے قرآن کی طرف

یحییٰ بن ابی کثیر کہتے تھے :-

السنۃ قاضیۃ علی الکتاب و — سنت کتاب اللہ پر حکم کرنے والی ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیس الکتاب قاضیاً علی السنۃ کتاب سنت پر حکم نہیں کرتی۔

اس سے اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ سنت قرآن کے تابع نہیں اور قرآن سنت کے تابع ہے۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی حیثیت متن کی اور سنت کی حیثیت شرح کی ہے۔ قرآن میں خفی بھی ہے، مشکل اور مجمل بھی، سنت ان سب کا بیان کرتی ہے اور ان کی تفصیل کرتی ہے۔ اس بنا پر سنت سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے اس سے فہم قرآن میں مدد لیجا سکتی ہے، اور سنت چونکہ شرح کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں خفا، اجمال و اشکال نہیں ہے۔ اس لیے قرآن مجید کو اس کے لیے مبین نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام بعض اوقات کسی مسئلہ کی نسبت کوئی حکم صادر فرما دیتے تھے لیکن بعد میں انہیں معلوم ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ اس کے خلاف ہے تو فوراً اس سے رجوع کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ بنو ثقیف کے ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ بیت اللہ کی زیارت کرنے کے بعد اگر کسی عورت کو حیض آجائے تو وہ کوچ کرے یا نہیں، آپ نے فرمایا نہیں" اس پر ثقفی بولا کہ اس قسم کی ایک عورت سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آپ کے فتوے کے خلاف فتویٰ دیا تھا"۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ کھڑے ہوگئے اور ثقفی کو دُرّہ سے مار کر فرمایا "جس چیز کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتویٰ دے چکے ہیں۔ تم اس کے متعلق مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو" ابن خزیمہ کہتے تھے "اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت ہو جائے تو اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کو کچھ کہنا درست نہیں ہے"[1]

جو لوگ حدیث کو بھی نہیں مانتے وہ ائمہ دین کے ان اقوال کو کیا مانیںگے لیکن ہم نے اُن کو اس غرض سے نقل کیا ہے کہ ان اقوال سے سنت کی اصل حیثیت پر روشنی پڑتی ہے ہم

[1] یہ سب اقوال و روایات مفتاح الجنۃ سے ماخوذ ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے بتایا ہے اس کے کہ سنت اور قرآن کے باہمی تعلق پر بحث کرتے ہوئے اپنے دلائل کے سلسلہ میں یہ چیزیں بیان کرتے، ان بزرگوں کے حوالہ سے انہیں بیان کردیا ہے۔

صحابۂ کرام جو زباندان ہونے کے باوصف درگاہِ نبوت سے براہِ راست فیضیاب ہونے کا شرف رکھتے تھے، اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ قرآن مجید مجمل ہے، کہیں اُس میں اشکال اور خفا پیدا ہوگیا ہے، اگر اُس اجمال وخفا کو دور کرنے کے لیے سُنت سے کام نہ لیا جائے تو ظاہر ہے کوئی مکمل ضابطہ احکام اور مجموعۂ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے۔ اقیموا الصّلوٰۃ نماز پڑھو۔ اٰتوا الزکوٰۃ۔ زکوٰۃ ادا کرو۔ السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیہما۔ احل اللّٰہ لکم البیع وحرم الربوا۔ اللہ نے تمہارے لیے خرید و فروخت حلال کردی اور سود کو حرام قرار دے دیا ہے لیکن تمام قرآن میں کہیں نہیں بتایا گیا کہ نماز کس طرح پڑھیں، اور اُس کے ارکان کیا ہیں اور اُن میں کیا ترتیب ہے؟ زکوٰۃ کس کس مال پر واجب ہے اور کتنی چوری کا ہاتھ کاٹنے کے لیے کوئی نصاب مقرر ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو اس میں بڑا اختلال لازم آتا ہے کسی نے ایک پیسہ چرا لیا، اور اُس کو دست بریدہ کردیا گیا۔ اور اگر نصاب مقرر ہے تو وہ کتنا ہے؟ پھر ایک چوری میں دونوں ہاتھ بیک وقت قطع کیے جائینگے، یا ایک ہی ہاتھ کاٹا جائیگا، اور اگر ایک ہی ہاتھ قطع ہوگا تو دایاں یا بایاں۔ اسی طرح قرآن نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام تو بتادیا لیکن لغت میں ربوا کے معنیٰ صرف زیادتی کے ہیں۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ اس زیادتی سے کیا مُراد ہے؟ اور کس قسم کی اور کتنی زیادتی حرام ہے۔ اگر صرف قرآن پر ہی مدار شریعت ہے اور الیومَ اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی فرما کر جس دین کے اکمال کا مُژدہ سُنایا گیا ہے۔ اگر اس کا منبع و مصدر صرف قرآن ہی ہے تو ان تمام تنقیحاتِ بالا کا جواب اُس میں ہونا چاہیے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اُس میں نہیں ہے۔ لہٰذا سُنت کو قرآن کے لیے بیان وتفسیر یا تفصیلِ اجمال قرار دیا جائے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دونوں کو ملا کر مدار دین و تشریع احکام کہا جائے تو بے شبہ قرآنِ مجید کا دعویٰ اتمامِ نعمت واکمال دین درست ہوسکتا ہے۔ اور خود قرآنِ مجید کی تصریحات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ سُنت اُس کے لیے بمنزلہ بیان و تشریح ہے۔ ارشاد ہے۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم — ہم نے ذکر آپ پر نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے لیے خوب کھول کر وہ چیز بیان کردیں جو انکی طرف نازل کی گئی ہے۔

غور کیجیے "لِتُبَیِّنَ" میں لام غایت کا ہے۔ اس لیے معنیٰ یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو قرآن نازل کیا ہے تو اُس کی غایت یہی ہے کہ آپ اُس کو کھول کھول کر لوگوں کے سامنے بیان کریں یعنی آپ ہی اس کے بہترین شارح مفسر اور اُس کے معانی و مطالب کو بیان کرنے والے ہیں۔ کوئی شخص فہم قرآن میں آپ سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔

مُطرّف بن عبداللہ سے کسی نے کہا "تم ہم سے سوائے قرآن کے اور کچھ بیان نہ کیا کرو" فرمایا "بخدا ہم قرآن کے بدلہ کسی اور چیز کو تمہارے سامنے پیش نہیں کرتے، البتہ احادیث سُنا کر اُس ذاتِ گرامی کا ارادہ کرتے ہیں جو ہم سب سے زیادہ عالم بالقرآن تھی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔[1]

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت سعید بن جبیر کے ساتھ پیش آیا۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک حدیث بیان کی۔ ایک شخص بولا "قرآن مجید میں تو اس کے خلاف ہے" سعید بن جبیر نے فرمایا: "میں ایک حدیث بیان کرتا ہوں اور تو اُس پر کتاب اللہ پیش کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیری بہ نسبت کتاب اللہ کو زیادہ اچھی طرح جانتے تھے"[2]

---

[1] مفتاح السنۃ ص ۱۲۔ [2] مسند دارمی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن کے اجمال اور سنت کی حیثیتِ تفصیل و بیان کی بنا پر صحابۂ کرام سنت کے ساتھ بہت اعتنا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اسی کے ذریعہ قرآن کی آیات کے صحیح معانی و مطالب متعین ہو سکتے ہیں حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے تھے "عنقریب تمہارے پاس ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن مجید کے شبہات کے ساتھ تم سے مجادلہ کرینگے۔ تم اُن پر سُنن کے ذریعہ گرفت کرنا، کیونکہ اصحابِ سُنن کتاب اللہ کے بڑے عالم ہوتے ہیں[۱]۔ بعینہٖ یہی مقولہ لالکائی نے حضرت علی بن ابی طالب سے نقل کیا ہے۔

علامہ ابن سعد نے طبقات میں بہ طریق عکرمہؒ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی نے اُن کو خوارج کے پاس بھیجا تو فرمایا "تم اُن کے پاس جاؤ اور مباحثہ کرو" مگر دیکھنا قرآن کو درمیان میں نہ لانا کیونکہ وہ معانی مختلفہ کو محتمل ہوتا ہے۔ البتہ ہاں سنت سے احتجاج کرنا" ابنِ عباس نے فرمایا "میں تو اُن کی بہ نسبت قرآن کو زیادہ جانتا ہوں، کیونکہ وہ ہمارے گھر میں ہی نازل ہوا ہے" حضرت علی بولے "ہاں! تم سچ کہتے ہو لیکن "القرآن حمّالٌ ذو وجوہٍ" قرآن میں اجمال و خفا کی وجہ سے) مختلف معانی کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ تم بھی کہتے رہوگے اور وہ بھی کہتے رہینگے فیصلہ کچھ نہ ہوگا، اس لیے سُنن سے استدلال کرنا، وہ اُس سے بچ کر کہیں نہیں جا سکینگے" چنانچہ حضرت ابن عباس نے خوارج کے ساتھ سُنت کی روشنی میں مناظرہ کیا تو وہ لاجواب ہو گئے۔

دین کا مدار قرآن و سُنت پر ہے

جیسا کہ ہم ابھی ضمناً اشارہ کر چکے ہیں دراصل دین کا دار و مدار ہی سُنت اور قرآن دونوں پر ہے۔ قرآن بہ طریق متن اور سُنت بہ طور تفسیر و تشریح ہے، اور تشریع احکام کا مبنیٰ دونوں ہیں۔ چنانچہ صحابۂ کرام و تابعین عظام بھی یہی سمجھتے تھے۔ اور ان دونوں پر ہی دین کا مدار رکھتے تھے۔ میمون بن مہران سے ایک روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس کوئی خصومت

---

[۱] مسند دارمی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کرآتا تھا تو آپ قرآن میں اُس کے لیے حکم تلاش کرتے تھے، اگر اُس میں نہ ملتا تو سنت میں تلاش کرتے تھے۔ اگر اُس میں بھی انہیں کوئی حکم دستیاب نہیں ہوتا تھا تو لوگوں کو جمع کرکے وہ مسئلہ پیش کرتے اور اُن سے پوچھتے کہ آپ کو اس مسئلہ کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ یاد ہے یا نہیں؟ وہ لوگ جواب اثبات میں دیتے تو آپ فرماتے

الحمد للہ الذی جعل فینا من یحفظ علینا دیننا۔ — تمام حمد ثابت ہے اُس اللہ کے لیے جس نے ہم میں دین کی حفاظت کرنیوالے پیدا کر دیے ہیں۔

جابر بن زید کہتے ہیں ایک مرتبہ طواف میں حضرت ابن عمرؓ ملے تو فرمانے لگے "ابو الشعثاء! تم فقہاء بصرہ میں سے ہو، بجز قرآن ناطق اور سُنت درست کے کسی اور چیز سے فتویٰ نہ دینا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو خود بھی ہلاک ہو گے اور دوسروں کو بھی ہلاک کرو گے"

اسی طرح ابو سلمہ بصرہ میں تشریف لائے اور حسن بصریؒ اُن سے ملنے آئے تو آپ نے حضرت حسن سے فرمایا "مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو، ہرگز نہیں کبھی ایسا نہ کرنا، جب تک تمہارے پاس مسئلہ مستفتی بہ سے متعلق کوئی سُنت یا قرآنی آیت نہ ہو"

سعید بن المسیب نے ایک شخص کو دیکھا کہ دو رکعتوں کے بعد بھی کچھ اور رکعتیں پڑھ رہا ہے، اس شخص نے نماز سے فارغ ہو کر پوچھا "ابو محمد! کیا خدا مجھ کو اس نماز پر عذاب دیگا؟" فرمایا "نماز پر نہیں بلکہ سنت کا خلاف کرنے پر" سعید بن جبیر فرماتے تھے "کوئی قول بغیر عمل کے اور کوئی قول و عمل بغیر نیت کے مقبول نہیں ہوتا۔ اور قول و عمل و نیت اُس وقت تک مقبول نہیں ہوتے جب تک کہ وہ سُنت کے موافق نہ ہوں" حضرت حسن بصری سے بھی اسی قسم کا ایک مقولہ مروی و منقول ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ اور اس طرح کے سیکڑوں آثار و روایات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ صحابۂ کرام اور اُن کے بعد تابعین عظام نے دین قیم کا دارومدار قرآن و سُنت کو ہی سمجھا۔ اور اس بنا پر جس طرح اُنھوں نے قرآن کی حفاظت اپنی جاں فروشانہ بے مثال قربانیوں سے کی۔ اور اُس کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لیے خون کے آخری قطرہ سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ٹھیک اسی طرح اُنھوں نے سُنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حرزِ جاں بنا کر رکھا اور اس کی حفاظت میں امکانی کوشش وسعی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ حضرت ابوذر غفاری فرماتے تھے۔ اگر میری گردن پر تلوار رکھ دی جائے اور مجھ کو معلوم ہو کہ میں قتل ہونے سے پہلے ایک کلمہ بھی جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے لوگوں تک پہنچا سکتا ہوں تو میں اُس امانت کو دوسروں تک ضرور پہنچا دونگا۔"

حضرت ابوہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر رکھے تھے، ایک میں سوتے تھے اور ایک حصہ صلوٰۃ و تلاوت قرآن میں بسر کرتے تھے۔ اور ایک حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث یاد کرتے تھے۔ آج جبکہ بنا بنایا مکمل دین آپ کے پاس ہے، آپ کو انکار حدیث کی جسارت ہوتی ہے لیکن اُس وقت کا تصور کیجیے جبکہ آپ کے پاس ایک حدیث بھی نہ ہوتی، اور صرف قرآن مجید ہوتا۔ تو کیا اُس وقت بھی دین کامل و قیم اپنی اس صورت میں آپ کو نظر آسکتا تھا؟

حدیث کی تشریعی حیثیت اور اُس سے غرض

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہم نے حدیث کی تشریعی حیثیت کا بار بار ذکر کیا ہے اور اُس کو سابق میں آیات بینات سے ثابت کر چکے ہیں لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیے کہ تشریع کے باب میں قرآن و حدیث دونوں ایک پلہ کے نہیں ہیں۔ قرآن قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ و المحکم ہے اور حدیث ظنی۔ دونوں قوت و حکم کے اعتبار سے یکساں کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اس بنا پر اگر کوئی حدیث قرآن مجید کے کسی قطعی حکم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے خلاف ہو تو اُس کو قبول نہیں کیا جائیگا۔ کیونکہ سند و الفاظ حدیث کے لحاظ سے اُس میں متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول اور وما آتٰکم الرسول فخذوہ دیکھ کر یہ شبہ ہو گیا ہے کہ قرآن کی طرح سُنت بھی تشریع میں مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ یہ خیال سراسر لغو اور غلط ہے۔ کیونکہ قرآن مجید نے ہی خود اس کی بھی تصریح کی ہے کہ

وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الّا وحیٌ یوحیٰ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے بلکہ وہ نازل شدہ وحی ہوتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل وحی (قرآن) ہے اور نطق نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام فرع۔ اِس بنا پر نطق گرامی کو وحی کے مطابق کرنے کی سعی ہونی چاہیے نہ کہ وحی ظاہر الدلالۃ کو نطق سامی کے ساتھ مطابقت دینے کی۔ اگر دونوں میں مطابقت پیدا نہ ہو سکے تو حدیث کو ترک کرنا پڑیگا لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلامِ گرامی ہے۔ بلکہ محض اس بنا پر کہ قرآن کے ایک حکم ظاہر الدلالۃ سے متعارض ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اُس قول کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب ہی نادرست ہے۔

پس سُنت کی تشریع سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی طرح اس باب میں ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے، بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ سُنت قرآن کے لیے بمنزلہ بیان اور تفصیل کے ہے۔ اگر کسی صحیح الثبوت سنت سے کوئی ایسا حکم ملے جس کی متعلق قرآن میں سکوت ہو یا اُس کے کسی ایک ہی پہلو کو بیان کیا گیا ہو یا اُس حکم کے بیان میں کسی قسم کا کوئی اشکال وخفا رہ گیا ہو تو ہم قرآن وسُنت دونوں کو ملا کر ایک حکم مفصل کا استنباط کرلینگے اور اس وقت قرآن کی حیثیت متن کی اور سُنت کی حیثیت شرح وبیان کی ہوگی۔ یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ تشریع کا دارومدار سُنت پر ہی ہے۔ اب ہم ذیل میں اس کی چند مثالیں لکھتے ہیں تاکہ تشریع بالسنت کی حقیقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پی طرح واضح ہو جائے۔

۱۔ قرآن میں صرف نماز کا حکم ہے لیکن رکعات کی تعداد نہیں بتائی گئی۔ سُنت نے اس کو بیان کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص مغرب میں دو، فجر میں تین، ظہر اور عصر و عشا میں پانچ پانچ یا دو دو اور تین تین رکعتیں پڑھیگا تو اُس کی نماز بالکل نہیں ہوگی اور وہ نہ صرف حکم سُنت کا مخالف کہا جائیگا بلکہ قرآن کا بھی۔

۲۔ قرآن نے صرف اتنا بتایا ہے کہ نکاح حلال ہے اور زنا و سفاح حرام لیکن نکاح مشروع کے علاوہ نکاح غیر مشروع کون کون سے ہیں، قرآن میں اُن کا تفصیلی ذکر موجود نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں ہے۔

ایما امرأۃ نکحت بغیر اذن ولیھا فنکاحھا باطل۔	جس عورت نے بغیر اجازت ولی کے نکاح کرلیا اُس کا نکاح باطل ہے۔

یہاں اس سے بحث نہیں کہ عورت سے باکرہ ثیبہ دونوں مُراد ہیں یا ایک، اور ولی کون ہے؟ اور ولایت کا خیار بلوغ پر مبنی ہے یا بکارت پر۔ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ آپ اس حدیث کو نظرانداز نہیں کر سکتے قرآن مجید نے نکاح کو اجمالاً بیان کیا ہے۔ احادیث صحیحہ میں نکاح کے جو شرائط صحت وغیرہ تفصیل کے ساتھ بیان کیے گیے ہیں اُن کو قرآن کے ساتھ ملا کر ایک پورا مکمل قانون نکاح تیار کرنا ہوگا۔

۳۔ قرآن میں صرف ربوا کی حرمت کا ذکر ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ ربوا سے مُراد کیا ہے؟ اور اس کی حرمت کا دارومدار کس چیز پر ہے؟ حدیث نے اس سوال کا جواب دیا۔ ارشاد نبوی ہے

الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبُرّ بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح	تم بیچو سونے کو سونے کے بدلے میں، چاندی کو چاندی کے، گیہوں کو گیہوں کے، جو کو جو کے، کھجور کو کھجور کے اور نمک کو نمک کے بدلے میں جنس بجنس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مثلاً بمثلٍ سواءً بسواءٍ یداً بیدٍ والفضلُ ربوا۔ برابر سرابر، دست بدست اور زیادتی ربوا ہے۔

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ قرآن مجید میں جو لفظ ربوا آیا ہے اُس سے مُراد کیا ہے؟ یہ دوسری بات ہے کہ اس حدیث سے بھی پوری تفصیل سمجھ میں نہیں آتی یعنی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حرمتِ ربوا کا دارومدار جنسیت اور تفاضل دونوں پر ہے یا فقط ایک پر۔ یا از قسم مکیلات و موزونات ہونے پر۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے تشریف لے گیے اور ہم پر ربوا کی حقیقت مکمل طور پر واضح نہیں ہوئی۔" تاہم غور کیجیے اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو کیا آپ محض قرآن سے ربوا کی کچھ تھوڑی بہت بھی حقیقت سمجھ سکتے؟ ہرگز نہیں پس ربوا کے متعلق جو احکام وضع کیے جائینگے اُن کے لیے قرآن کو اصل اور حدیث کو اُس کا بیان قرار دے کر کیے جائینگے۔

۴۔ قرآن مجید میں .... دو بہنوں کو نکاح میں بیک وقت جمع کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ صاحبِ قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اس تحریم کی وجہ یہ ہے کہ دو بہنوں کو نکاح میں جمع کر دینے سے قطع صلہ رحم لازم آجاتا ہے جو اللہ کے نزدیک انتہائی مبغوض اور قبیح چیز ہے۔ ان کے علاوہ بھانجی اور خالہ اور بھتیجی اور پھوپی ان دونوں کو اگر نکاح میں جمع کر دیا جائے تو اس سے بھی قطع رحم لازم آتا ہے اس بنا پر آپ نے ان کے جمع فی النکاح کی حرمت کا بھی اعلان فرما دیا۔ آپ کے اس فرمان کو ہم حکم قرآن کے خلاف نہیں کہہ سکتے بلکہ اس کی تعبیر یہ کریں گے کہ قرآن نے جمع بین الاختین کا ذکر کر کے صرف اس حکم حرمت کی علت بیان کی ہے اور مقصد یہ نہیں ہے کہ حرمتِ جمع کے حکم کو صرف اس پر ہی محدود رکھا جائے اس لیے آپ کو بحیثیت شارع اسلام ہونے کے اس کا حق ہے کہ قرآن کی اس اصل کی روشنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں دو بہنوں کے علاوہ بھانجی اور خالہ اور بھتیجی اور پھوپی میں جمع فی النکاح کرنے کی حرمت کا بھی اعلان فرمادیں۔

ان چند مثالوں سے یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ ہم حدیث کی تشریعی حیثیت سے کیا مراد لیتے ہیں یعنی جب ہم کسی چیز کے متعلق احکام وضع کرنا چاہتے ہیں تو قرآن مجید کو اصل قرار دے کر احادیث کا تتبع کرتے ہیں اور پھر دونوں کی تطبیق سے مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ سنت کو مستقل تشریعی حیثیت حاصل ہے۔ اور قرآن مجید سے قطع نظر کر کے صرف سنت سے استخراج احکام کیا جا سکتا ہے۔ علامہ ابو اسحاق الشاطبی متوفی سنہ ۷۹۰ھ نے "الموافقات" کی جلد چہارم میں صفحہ ۱۳ سے صفحہ ۴۰ تک میں اسی پر مفصل بحث کی ہے کہ سنت کو کتاب اللہ سے منطبق کرنے کی کتنی صورتیں ہیں اور اس ذیل میں مختلف مذاہب بیان کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں۔

"سنت میں جو معانی اور احکام تفصیلیہ پائے جاتے ہیں وہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں لیکن وہ صرف اُنہی لوگوں کو معلوم ہو سکتے ہیں جو قرآن میں تفقہ تام رکھتے ہوں اور اُس میں تدبر کرتے ہوں۔ اگرچہ وہی معانی اور احکام سنت میں زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ملینگے۔"

© rasailojaraid.com